ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
etitor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.4,Issue No.1(2022)
(January to June)

مرزااطہر بیگ کے ناولوں کا مزاحمتی بیانیہ

The Resistance Narrative of Mirza Athar Baig's Novels

ڈاکٹر محمد کامران شہزاد
سرگودھا،پنجاب،پاکستان

Abstract

Among the important novelists of the 21st century, Mirza Athar Baig is also a reliable name, who is basically a teacher of philosophy. who has created four novels so far. He has experimented with themes, techniques and styles in his novels. This paper attempts to highlight the various aspects of resistance in his first three novels, Ghulam Bagh, Sifar sa Ek Tak, and Hasan ki Sorat e Haal, Khali.... Jagha.... Pur.... Karu. There is a cemetery on the way to the city office. If you look at the books on the graves, there is also a book of Hasan Zaheer among those books. In this curiosity, he goes straight to the grave on a stormy night, on which he is surprised to see the date of birth and death on the same day, and he dies on the same grave. The novel ends with the death of the main character. In the novel, the author has quantified the effects of World War II on the whole world before the establishment of Pakistan. In this context, the aspect of Japanese resistance that the novelist has introduced is very surprising. Just an atom in the battlefield. Seeing the destruction of the cities after the dropping of the bomb, Japan laid down its arms but kept the stigma of humiliation with its heart. Thus he turned the battlefield.

Key Words. Mirza Athar Baig,Urdu Novel, Resistance, Hasan Zaheer,
Death,

مرزااطہر بیگ عصر حاضر کے نمائندہ ناول نگاروں میں شمار ہوتے ہیں جن کے ناول ہیئت، اسلوب اور موضوعات کے لحاظ سے منفرد ہیں انھوں نے اپنے ناولوں میں کئی نئے طرح کے تجربات کیے ہیں اور اردو ناول کے دامن کو متنوع جہات سے مالا مال کر دیا۔ مرزااطہر بیگ کا پہلا ناول "غلام باغ" (۲۰۰۶ء) اکیسویں صدی کے اہم ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ 878 صفحات پر مشتمل اس ضخیم ناول کا عنوان انفرادی حیثیت کا حامل ہے کیونکہ ناول آثار قدیمہ سے تعلق رکھتا ہے، جس کی اپنی تاریخی اور تہذیبی شناخت ہے اسی غلام باغ میں ایک کیفے ہے۔ ناول کا آغاز کیفے غلام باغ میں کبیر اور ناصر کے مابین فلسفیانہ گفتگو سے ہوتا ہے ان کے علاوہ فریڈرک ہاف مین اور زہرہ بھی ناول کے اہم کردار ہیں۔ ناول کے کرداروں کے مابین مکالموں سے ناول کے موضوع کی پرتیں کھلتی ہیں کہ ازل سے انسان اپنی آزادی کے لیے جنگ لڑ رہا ہے۔ انسان اپنی برتری کے لیے دوسرے انسانوں کو روندتا ہوا آگے نکلنے کا خواہش مند ہے ۔ انگریزوں کے جانے کے بعد بھی یہ آزادی اور غلامی کا جھگڑا موجودہ عہد میں بھی اپنی تمام تر قباحتوں کے ساتھ جاری وساری ہے۔ ناول کے موضوع کے متعلق اطہر بیگ انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"غلام باغ، کا ایک بڑا موضوع انسان کی انسان پر، قوموں کی قوموں پر اور نسلوں کی نسلوں پر غلبہ پانے کی خواہش ہے غلبے کی بات ہو گئی تو Power Relation موضوع بنے گا۔"(۱)

ناول میں اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس حد تک بڑھ کر جذبات کی عکس بندی بھی کی گئی ہے، جس کو حرف عام میں پاگل پن یا جنونی کیفیت کہا جاتا ہے۔ ناول نگار نے اس کیفیت کو "دیوانگی" کہا ہے انٹرویو میں مزید وہ کہتے ہیں:

"دیوانگی، غلام باغ کے بنیادی موضوعات میں سے ایک ہے۔ فلسفے کے طالب علم کی حیثیت سے بھی یہ موضوع مجھے بہت Fascinate کرتا ہے۔ ہمیشہ سے یہ احساس رہا ہے کہ فرزانگی اور دیوانگی میں بال برابر کا فرق ہے۔"(۲)

بنیادی موضوعات کے علاوہ ناول میں مابعد نو آبادیاتی اثرات کو بھی دکھایا گیا ہے۔ انگریزوں کا برصغیر سے چلے جانے کے باوجود یہاں کی قوموں میں جو رویے اور نفسیاتی دباؤ ظاہر ہوتا ہے۔ اس کا اظہار ناول کا کردار کبیر مہدی اپنے دوست ہاف مین سے کئی جگہ کرتا نظر آتا ہے۔ غلام باغ کو اگر مزاحمتی تناظر میں دیکھا جائے تو اطہر بیگ نے سماجی مزاحمت کی کئی پرتیں کھولی ہیں۔ ناول کے آغاز میں ہی مزاحمت کا ایک بالکل عجیب و غریب منظر اس وقت سامنے آتا ہے جب غلام باغ میں مدد علی سونے کی اشرفیوں کے صندوق کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے وکٹورین دور کے سونے کے ایک سکے کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے یہاں ناول نگار نے ڈرامائی انداز اپنایا ہے انہوں نے مدد علی کے سکے ڈھونڈنے، چوکیدار کے اس پر حملے کرنے، مدد علی کے سکہ منہ میں ڈال کر منہ بند کرنے کے بعد بے ہوش ہونے کا منظر حیران کن ہے۔ بعد ازاں ڈاکٹر ناصر کا مدد کو ہوش میں لانے کے بعد منہ سے سکہ بر آمد کرنے کی کہانی کو ڈرامائی انداز میں بیان کی ہے یہاں مدد علی کی مزاحمت کا انداز فطری بھی ہے اور حقیقی بھی:

"نیوروسائکیاٹری کی ایمرجنسی میں ایک بستر پر لیٹے مدد علی کے جسم میں مسکن سیال کو داخل ہوئے اب تقریباً پندرہ منٹ گزر چکے تھے، اس کے ذہن میں آندھی چل رہی تھی، جس میں اس شام کے مناظر پتوں کی طرح اڑ رہے تھے "ایک تو اس حرام کے جنے چوکیدار نے پیچھے سے ایسا ہاتھ رسید کیا کہ ہوش نہ رہا وہ تو شکر ہے مولا پاک کہ گرتے گرتے بھی منہ میں چھپا لیا ورنہ وہیں چھین لیتا۔ اور پھر ہوش آیا تو سب مجھ ہی پر نظریں گاڑے کھڑے تھے اور اب بھی گاڑے کھڑے ہیں۔ منہ سے نکالتا بھی تو کیسے؟، فوراً دیکھ لیتے اور کہیں چھپاتا بھی تو کیسے؟ کیسے؟۔۔۔ کے۔۔۔۔ سے۔۔۔۔؟ اب تو منہ میں ہی رہے گا اور میرے ساتھ ایک بار پھر بے ہوش ہو جائے گا۔ عاشق علی بھی میرے اشارے نہ سمجھا۔۔۔ کہ منہ میں چھپایا ہے، سمجھو۔ سب کو

یہاں دیکھا نہیں سکتا۔۔ کہیں یہ میرے پیٹ میں ہی نہ اتر جائے۔ نواب صاحب نے
اس کے اچھے خاصے پیسے دے دینے تھے۔"(۳)

ناول میں ذاتی تعصب کے خلاف مزاحمت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ کم ذات ماسٹر کرم الٰہی کے پڑھ لکھ کر مدرس بننے کے بعد چودھری "رحیم کا چھر" نے اس کی اکڑ کو ختم کرنے کے لیے ماسٹر سے استعفیٰ دلوایا بعد ازاں اپنے ہاں منشی گیری کرنے اور پھر جوتے جوتے مار مار کر نکال دینے کی روداد بیان کی ہے اس کے بعد کرم الٰہی کی طرف سے شدید مزاحمت اور اس کے پنجے میں چودھری رحیم کی الم ناک موت، کرم الٰہی کی پہلے پھانسی اور پھر عمر قید کی کہانی کو کربناک انداز میں بیان کیا گیا ہے:

"پھر جانے کیسے ان میں ایک پھوں پھاں والا ماسٹر کرم الٰہی پیدا ہو گیا۔ چودھری رحیم کا چھر نے پہلے تو اس کی اکڑ توڑنے کے لیے اسے بڑی بھاری تنخواہ پر اپنے پاس منشی رکھنے کی ترغیب دی، اسے ماسٹری سے استعفیٰ دلوایا، اپنے پاس منشی رکھا اور پھر جوتے مار کر نکلوا دیا۔ مانگر کو سبق سیکھانے کا تجربہ رنگ کا چھر کو بڑا مہنگا پڑا۔ مستعفی ماسٹر نے رحیم چودھری کو اس کے گھر کے سامنے چھریوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اسے پھانسی کی سزا ہوئی مگر پھر اپیل پر بڑے انگریز جج نے جب ملزم سے انگریزی کے کچھ صحیح گرائمر کے فقرے سنے، خدا جانے اس کے جی میں کیا آئی، اس نے پھانسی کی سزا کو کالے پانی کی سزا سے بدل دیا۔ کہتے ہیں کہ وہ مانگر جاتی میں پیدا ہونے والا سب سے پڑھا لکھا تھا۔"(۴)

ناول نگار مزاحمت کی نئی جہت سے آشنا کراتے ہیں۔ حکیم احسان الٰہی کو بھیجی جانے والی مردانہ شباب کے نسخے پر مشتمل کتاب خادم حسین ڈاکیار کھ لیتا ہے۔ یہاں یہ بات سامنے آتی ہے کہ بادشاہ اپنے عوام کی عورتوں کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں۔ خادم حسین نے اپنی مانگر عورتوں کو اپنے علاقے کے وڈیروں، اچھروں اور دیگر لوگوں سے بچانے کے لیے ان وڈیروں کے شباب کو کم کرنے کے لیے حکیم احسان الٰہی کے نسخے کو روکا۔ اطہر بیگ نے اس صورت حال کو ان الفاظ میں رقم کیا ہے:

"ابا جی ۔۔ یہ آپ نے کمال کر دیا۔ کم از کم انعام گڑھ کے بادشاہوں کو تو آپ نے درازیٔ عمر اور شباب دائمی کے ان مجربات سے محروم کر دیا۔۔۔ ان کی عمریں اور ان کا شباب کچھ نہ کچھ تو ضرور مختصر ہو گا۔۔۔ آپ کی وجہ سے ۔۔۔" اور پھر وہ ہنسا۔ مگر اب خادم حسین اس کی ہنسی میں شامل ہونے کے بجائے، لرز کر رہ گیا۔ وہ یاور کی بات کی رمز جان گیا تھا، کا چھروں، پگلوں کا دائمی شباب مانگر جاتی کے لیے اور ان کی عورتوں کے لیے کیا مطلب رکھتا تھا۔ خادم حسین سے زیادہ کون جانتا تھا۔"(۵)

محض اس خیال سے کہ پیدا ہونے والا بچہ سفید فام ہے، اس کو جان سے مار دینے کے بجائے غار میں پھینک آتے اور علاقہ مکین کو معلوم ہونے کے بعد غار میں جا کر دیکھنے سے بچہ کے زندہ ہونے اور اس دوران ماں کی بھرپور مزاحمت اور بچے کو دودھ پلانے کی روداد کو دلکش انداز میں بیان کیا ہے، ماں سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن اولاد پر ہونے والے ظلم کو برداشت نہیں کر سکتی اور اس کے خلاف بھرپور مزاحمت کرتی ہے سادہ بیانیے میں اطہر بیگ نے مزاحمت کے اس پہلو کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "وہ سادہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ بچے کی ماں اور دائی چھپ چھپ کر آتی تھیں اور اس ننھی جان کو دودھ پلاتی تھیں۔ یہ ان دونوں عورتوں میں راز تھا اور انہوں نے اسے راز ہی رکھا۔ اگر بتاتی تھیں تو خطرہ تھا کہ باپ پھر اس کو مارنے کی کوشش کرے گا۔ اگر بچے کا معجزہ بنتا ہے تو بنے، اس طرح وہ زندہ تو رہے گا، وہ کیوں سچی بات بتا کر اس کی جان گنوائیں۔ گاؤں کے لوگوں کے دل قدرت کی شان سے بھر گئے۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ سجدہ کریں۔ انہوں نے وہیں نماز پڑھی اور فیصلہ کیا کہ سب نے مل کر کہ وہ بچہ ہو سکتا ہے کوئی پیر فقیر یا ولی ہو اور سنمیال کے لیے رحمت بن کر آیا اور وہ ہمیشہ اس غار میں رہے گا۔ غار اس کا گھر بنے گا۔"(۶)

پارٹی میں نامساعد حالات دیکھ کر نواب ثریا جاہ جنگ کے اچانک مشتعل ہونے اور یاور عطائی کے خلاف دل کی بھڑاس نکالنے کی کتھا کو ناول نگار نے عمدگی سے بیان کیا ہے۔[i]

کبیر مہدی کا ہاف مین کے ساتھ مکالمے کے دوران غلام باغ کے مالک کو غلام کہنا اور مسخرے پن پر اترنے سے ہاف مین، نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے تذلیل محسوس کی تو نواب ثریا جاہ کے مشتعل ہونے اور کبیر پر جھپٹ پڑنے اور کبیر کا اپنا بچاؤ کرنے کی کہانی کو ان الفاظ میں رقم کیا ہے:

> "ہاں مگر۔۔۔" کبیر نے حیرت سے کہا اور بیشتر کہ وہ اپنا فقرہ مکمل کرتا۔ نواب ثریا جاہ نادر جنگ اپنا جسمانی توازن بھی کھو بیٹھا اور کبیر پر جھپٹ پڑا مگر اس کی یہ بے اعتدالی ادھوری ہی رہ گئی کیونکہ نجم الثاقب کے بعد اب وہ تیسرے کونے کے غسل خانے تک پہنچنے میں ناکام رہا اور آٹھ دس دوست جو اب کبیر اور گورے کے مکالموں سے کچھ عجیب طرح سے لطف اندوز ہونے لگے تھے۔ نواب کے اچانک 'حملے' کی وجہ سے تیزی سے پیچھے ہٹ گئے اور نواب ثریا جاہ و نادر جنگ کے لیے بھی اندر باہر کے فاصلے مٹنے لگے۔"(۷)

ناول نگار نے کیفے غلام باغ کا بیرہ عاشق علی کا اپنے جیسے انسانوں سے بے معنی انتقام لینے کی روداد کو متحیر خیز انداز میں بیان کیا ہے کہ کیفے میں چاروں دوستوں کے لیے نشستیں مخصوص ہو چکی تھیں ان کے نہ آنے پر عاشق علی دیگر لوگوں کو گھٹیا معیار کی چائے پلا کر بے معنی انتقام لیتا ہے یہاں مزاحمت کا انداز انفرادی بھی ہے اور منفرد بھی ہے:

"وہ چاروں کیفے غلام باغ میں تھے، اس میز کے گرد جو اب تقریباً انھی کے لیے مخصوص ہو چکی تھی اور عاشق علی بیرہ ہر روز ان کی متوقع آمد سے پہلے اسے خوب چمکانے کی کوشش کرتا تھا۔۔۔ اور وہ نہیں آتے تھے۔۔۔ اور کوئی دوسرا وہ میز سنبھال لیتا تھا تو اس کا دل بڑا خراب ہوتا تھا اور وہ۔۔۔ بدنصیبوں کو گھٹیا ترین چائے پلا کر انتقام لیتا تھا۔"(۸)

ناول کے مرکزی نسوانی کردار "زہرہ" کی بوڑھے سراج دین کی مدد اور طیش کے حالات میں نواب ثریا جاہ کو تھپڑ مارنے کی کہانی کو بھی بیان کیا ہے۔ کبیر کو قتل کرنے کے بعد امیر جان کے ناصر اور زہرہ کو قتل کرنے کی کوشش اور ناصر کی بھرپور مزاحمت کے نتیجے میں امیر جان کے ہلاک ہو جانے کے منظر کی عکاسی بھی منفرد الفاظ میں کی ہے:

"ناصر نے دیکھا کہ اچانک زہرہ الٹے قدم، کچھ جانے بغیر گہراؤ کی طرف جا رہی ہے اور پھر اس نے ناصر کو نشانہ بنانے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ ناصر نے ان لمحوں میں جنون میں جب موت اچانک سامنے اترتی ہے۔ زہرہ کو آواز دی "زہرہ پیچھے مت جاؤ" اور پھر اپنی موت کے ساتھ اس موت لانے والے کی موت یقینی بنانے کے لیے وحشت کے عالم میں کسی تند خو جانور کی طرح اس کے جسم سے ٹکرایا۔ اسی ٹکراؤ میں گولی اس کے کندھے کے قریب سے گزر گئی اور امبر جان، جو چند قدم ہی پیچھے چھپی، گہراؤ کی موت سے آگاہ نہیں تھی۔ انہیں پھر سے نشانہ بنانے کے لیے تیزی سے پیچھے ہٹا اور اتنا کچھ ہی اس کے توازن کے خاتمے کے لیے ضروری تھا۔"(۹)

ناول نگار نے سماجی رشتوں کی شکست وریخت اور کسی ایک فرد کے دوسروں کے حقوق کے لیے خطرہ بن جانے پر اس کے خلاف مشترکہ مزاحمت کو بیان کرتے ہوئے ازلی نسلوں کی پوری کہانی ناول میں بیان کی ہے۔

مرزا اطہر بیگ کے دوسرا ناول "صفر سے ایک تک" (2009ء) کا بنیادی موضوع کمپیوٹرائزیشن یا ڈیجیٹل انقلاب ہے، جس نے موجودہ عہد میں ہمارے معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں علاوہ ازیں ناول میں نائن الیون کو بھی موضوع بنایا گیا لیکن یہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ناول میں بے گناہ باپ کے پھانسی چڑھنے کے بعد بیٹے کے ذہن میں نفرت کے الاؤ کے بھڑکنے اور وڈیو گیمز کی وحشت زدگی اور اس مزاحمت کی لو کو تیز کرنے کی کہانی کو دردناک انداز میں بیان کیا گیا ہے:

"پھر ایک دن پتہ نہیں اُسے کیا ہوا کہ گیم سینٹر چھوڑ کر وہ گیا اور ڈائرکشن کیز کی بجائے پستول کے ٹریگر کی کلک کلک سے اُس نے کونسلر اور اُس کے دو گرگوں کو گولی مار دی پھر سیدھا تھانے چلا گیا اور کہنے لگا "ہاں اب دو مجھے پھانسی"۔ لمبی بات ہے کہ بتاؤں۔ لیکن اُس دن دیر تک میں سوچتا رہا کہ Tekken نامی اس ویڈیو گیم میں پروگرامز اور Designers سے یہ بنیادی خرابی یا کمی رہ گئی ہے کہ یہ کھیلنے والے کو پوری طرح مطمئن نہیں کرتی اور وہ ماؤس کی کلک کلک سے پوری طرح شانت ہونے کی بجائے کسی اور طرح کی کلک کلک کی طرف نکل جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ مثال ویڈیو گیم کی کلک کلک آخری ہونی چاہئے۔"(۱۰)

ناول کے مرکزی کردار "ذکی" کو فیضان کے پاس جانے سے روکنے کے لیے فیضان کے باپ کی ذکی کو دی جانے والی دھمکیوں اور اس کے جواب میں ذکی کی بھرپور مدافعانہ کارروائی کو اطہر بیگ نے عمدگی سے بیان کیا ہے۔ باپ کے منع کرنے کے بعد بیٹے کی مزاحمت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"بکومت۔۔واپس چلے جاؤ۔۔۔آئندہ اُدھر منہ بھی نہ کرنا۔ جسے ملنے جارہے ہو۔ آئندہ قریب بھی نہ پھٹکنا اُس کے۔ ورنہ تم جانتے ہو۔"

"جی سر جانتا ہوں۔ لیکن سر آپ غصے میں آگئے آپ تو ایسے نہ تھے "میں نے ہنس کر کہا لیکن پھر ایک پریشان کن خیال گزر گیا۔ کیا میں خود ابھی تک اُسی ڈرامے بازی کی کیفیت میں ہوں۔ کیا یہ پرفارمنس ہے۔"

"شٹ اپ یو۔۔۔دوسری طرف سے آنے والی آواز بہر حال پرفارمنس نہیں تھی "تم اُس کے قریب بھی نظر نہیں آؤ گے۔ کبھی نہیں۔"

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ کوئی مجھے اُس کے قریب جانے سے روک نہیں سکتا"۔

"تم اُس سے نہیں ملو گے "آواز نے چیخ کر کہا۔

"نہیں۔۔ایسا نہیں ہو سکتا۔۔یہ سالار میرا ہے "میں نے چیخ کر کہا اور چیختا رہا "یہ سالار میرا ہے۔ یہ سالار میرا ہے"۔

دوسری طرف سے آنے والی آواز اب واضح طور پر ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔"(۱۱)

مرزا اطہر بیگ کا ناول "حسن کی صورتِ حال۔ خالی۔۔۔ جگہیں۔۔۔ پُر۔۔۔ کرو"(2014ء) بنیادی طور پر "حسن ظہیر" کی کہانی ہے۔ ناول میں حسن ظہیر کے بچپن سے لے کر وفات تک کے حالات و واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ مرکزی کردار کو

بچپن سے نہ صرف مختلف چیزوں سے متعلق جستجو رہتی تھی بلکہ خود سے ان چیزوں کی توجیہات بھی کرتا رہتا تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد حسن کو ایک مالیاتی کمپنی میں ملازمت ملتی ہے جو شہر سے دور افتادہ مقام پر واقع ہے۔ کمپنی کی وین میں حسن ظہیر اپنی مخصوص نشت پر ہی سفر کرتا ہے، جس پر بیٹھ کر وہ چیزوں کو دیکھتا ہے اور خالی جگہیں پر کرتا رہتا ہے

ناول میں حسن کی کہانی کے ساتھ ساتھ دو ثانوی کہانیاں بھی چلتی ہیں جن میں ایک کباڑ کمپلیکس اور دوسری فلم کی پروڈکشنز کی ہے۔ یہ دونوں کہانیاں حسن کی نیچر کے قریب تر ہے کیونکہ دوران سفر وہ انہی واقعات کو دیکھتا ہے۔ پہلا واقعہ کباڑ کمپلیکس کے جبار سے شروع ہوتا ہے، جو چوک خداداد میں "عظیم نجات دہندہ" سے نجات ملنے کی خوشی پر مٹھائی جمع کر رہا ہے۔ جبار کباڑ کمپلیکس میں ارشاد کباڑیہ کا ساتھی ہے۔ جبار کو عجیب و غریب اشیا اکھٹی کرنے کا شوق ہے مثلاً کبھی مٹھائی، کبھی لکی سٹار کے بونے اور کبھی قبریں گننا شروع کر دیتا تھا۔ اس کے علاوہ بوتلیں، چاقو، بکسوئے، تالے وغیرہ جمع کرتا رہتا اور وہ یہ سب گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے لیے جمع کرتا تھا۔

چوک خداداد میں فلم پروڈکشنز سیفی جبار کو دیکھتا اور اس سے متاثر ہو جاتا۔ سیفی اپنی نئی آنے والی فلم میں کردار کے لیے جبار کو منتخب کرتا ہے۔ اور اپنی فلم کی باقی ٹیم انیلا اور ڈایریکٹر سعید کمال سے بھی تعارف کرواتا ہے۔ فلم پڑوڈکشنز کے لوگ کباڑ کمپلیکس کے علاوہ ایک سرکس کو بھی فلم کا حصہ بناتے ہیں۔ یہ لوگ فلم کی لوکیشن دیکھنے جاتے ہیں جہاں وہ سرکس کا شو بھی دیکھتے ہیں۔ اسی دوران حسن ظہیر اپنے تبادلے کے سبب بے چینی کی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے کیونکہ وہ تبادلے سے ناخوش بھی ہے اور اس کی منظر بینی میں بھی فرق پڑتا ہے لہذا وہ کمپنی کے ڈاکٹر سے رابطہ کرتا ہے تو ڈاکٹر حسن اسے کوڈایازی پام کی دوا تجویز کرتا ہے۔ کمپنی کے آڈٹ کے لیے حسن کو شہر سے باہر جانا پڑتا ہے تو وہ دوا ساتھ رکھنا بھول جاتا ہے۔ راستے میں میڈیکل سٹور سے مطلوبہ دوا طلب کرتا ہے تو دوا کی عدم دستیابی کے سبب دکاندار متبادل کمپنی کی دوا دینے پر رضامند کر لیتا ہے۔ حسن ظہیر دوا کی زیادہ مقدار کھا لیتا ہے جس کے زیر اثر سورج مکھی کے کھیت میں چلا جاتا ہے اور وہاں سے ہوتا ہوا سرکس دیکھنے چلا جاتا ہے جہاں وہ فنکاروں پر پیسے لٹاتا ہے اسی دوران اقبال عرف بالی اور پولیس والے کا جھگڑا ہوتا ہے اور فلم کی پوری ٹیم اور حسن ظہیر کو ایک رات حوالات میں گزرانی پڑتی ہے۔

شہر کے دفتر کے راستے پر ایک قبرستان ہے۔ جس میں قبروں پر لگے کتبوں کو دیکھتا ہے تو انہی کتبوں میں ایک کتبہ حسن ظہیر کا بھی ہے۔ اسی تجسس میں وہ ایک طوفانی رات سیدھا اس قبر پر جاتا ہے جس پر ایک ہی دن کی تاریخ پیدائش اور وفات دیکھ کر حیرت زدہ ہوتا ہے اور اسی قبر پر ہی اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ مرکزی کردار کی موت کے ساتھ ہی ناول اختتام پذیر ہوتا ہے۔

اطہر بیگ کا یہ ناول دیگر ناولوں سے کئی حوالوں سے منفرد حیثیت رکھتا ہے کیونکہ ناول میں کئی کردار ایک جیسے ناموں سے تخلیق کیے گے ہیں۔ چند ادارتی نوٹ اور مصنف کے براہ راست کلام سے بیانیہ تشکیل کیا گیا۔ مرزا اطہر بیگ نے اقبال خورشید کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

"اگر ناول میں تجربات نہیں ہیں، تو یہ پاپولر ناول تو ہو سکتا ہے، مگر ادبی نہیں ہو گا۔ ادبی ناول میں کسی نہ کسی سطح پر تجربہ ضرور ہوتا ہے۔"(۱۲)

مصنف نے ناول میں قیامِ پاکستان سے قبل جنگِ عظیم دوم کے پوری دنیا پر اثرات کو رقم کیا ہے اس ضمن میں جاپان کی مزاحمت کے جس پہلو سے ناول نگار نے آشنائی دلائی ہے۔ وہ انتہائی حیرت انگیز ہے۔ جنگ کے میدان میں محض ایٹم بم کے گرانے کے بعد شہروں کی بربادی کو دیکھ کر جاپان نے ہتھیار پھینکے لیکن ذلت کے داغ کو دل سے سجائے رکھا۔ یوں انھوں نے میدانِ جنگ کا رخ موڑا۔ امریکہ اور اس کے حواریوں کو الیکٹرانکس کی دنیا میں ہزیمت اور جاپان کو محتاج ہونے پر مجبور کر دیا۔ مصنف نے اس صورتِ حال کی عکس بندی ان الفاظ میں کی ہے:

"ہیروشیما اور ناگاساکی کے اختتام کے بعد جاپان نے اپنی خردافروزی اور نفاست پسندی کا رخ مائیکرو الیکٹرونکس کی طرف موڑ دیا تھا اور جلد ہی کم از کم اس ٹیکنالوجی کے میدان میں دنیا پر غلبہ حاصل کر لیا تھا اور اس کی مشہور کمپنیوں کی بیک وقت باکفالت اور معیاری مصنوعات پوری دنیا پر چھا گئیں۔ ولسن اینڈ کڈ نامی امریکی کمپنی نے بھی اپنے عالمی آرڈر میں متعلقہ جاپانی آلات کو اپنی ملکی مصنوعات کے ساتھ گویا از سرِ نو درآمد کرنا زیادہ منفعت بخش جانا۔"(۱۳)

عوام اور حکمرانوں کے درمیان سرد جنگ میں حکمرانوں کے عوام پر کیے ریاستی جبر کے خلاف عوام کے دلوں میں بھڑکتے شعلوں اور حکمرانوں کے خلاف ریاست اقدام کی کارروائی کو عمدگی سے صفحۂ قرطاس کی زینت بنایا ہے یہاں مصنف کا بیانیہ قدرے عام فہم ہے:

"ہنگامہ فرو کرنے والے دستے کے سربراہ نے عظیم نجات دہندہ سے نجات مانگنے والے فسادیوں کو خبردار کیا کہ وہ فوراً منتشر ہو جائیں ورنہ سخت کارروائی کی جائے گی لیکن پھر جب وہ میگا فون کو دائیں سے بائیں ہاتھ میں منتقل کر رہا تھا تاکہ اوپر سے احکامات حاصل کرنے کے لیے وائرلیس تک رسائی حاصل کر سکے تو کارروائی فسادیوں کی طرف سے شروع ہو گئی۔ شاید وہ پہلا پتھر ہی تھا جس اس کے بائیں ہاتھ پر گرا تھا۔ زر کی بیشتر شدت اس کی انگلی اور انگوٹھی نے برداشت کی لیکن بقیہ قوت پھر بھی اتنی شدید ضرور تھی کہ میگا فون کے اندرونی نظام کو ہلا کر رکھ دیتی لیکن قابلِ فہم طور پر اس وقت میگا فون کے بجائے اپنے جسمانی نظام کی فکر لاحق ہو گئی۔ پتھراؤ جاری تھا

مگر دو محافظ حفاظتی شیلڈیں استعمال کرتے ہوئے تیزی سے اپنے انچارج کو اس کے لہو
لہان ہاتھ سمیت ہسپتال لے گئے "(۱۴)

ناول میں انسانی وہم کے خلاف بھی مدافعت نظر آتی ہے۔ بچپن میں اعتماد سے عاری زندگی گزارنے والے بالآخر خود کو خیالی ہیولوں سے نبرد آزما ہونے کی ٹھان لی یہاں ناول نگار کا بیانیہ انتہائی گنجلک اور کس حد تک غیر حقیقی بھی نظر آتا ہے:

"حسن ہمیشہ اپنے آخری متبادل کے طور پر سب کچھ "ہو سکتا ہے میری نظر کا دھوکہ ہو"
کے کھاتے میں ڈال سکتا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہی اس کے ذہن کے کسی حصے نے
پہلی دفعہ احتجاج کیا ہو گا۔ دھوکہ ایک بار ہو سکتا ہے، دوبارہ ہو سکتا ہے، تیسری بار
شاید۔۔۔ لیکن یوں بار بار تو نہیں ہو سکتا، کیسے ہو سکتا ہے؟"(۱۵)

انسانی ہوس کے لامحدود دائرہ کار میں سفر کرتے جبار کے خون آشام پنجوں کا شکار خالدہ ہوئی جب ایک شام خالدہ ٹیوشن سے واپس آرہی تھی تو جبار نے اپنی جنسی ہوس کا نشانہ بنانے کے لیے اس کو نیم بے ہوشی کی حالت میں اغوا کر کے اپنے کمرے میں لے جہاں خالدہ کی جبار کے ہاتھوں عصمت دری ہوئی۔ بعد ازاں خالدہ بھاری رقم کو نظر انداز اور شور کرنے لگی تو جبار نے اپنے گناہ کا پردہ چاک ہونے کے ڈر سے خالدہ کو ہمیشہ کے لیے موت کی کھائی میں پھینک دیا جہاں سے کبھی واپسی ممکن نہیں تھی۔

ناول میں امام مسجد کمال دین کا بیٹا جو شہر ڈاکٹر بننے کی خواہش لے کر گیا تھا لیکن وہ ایک جہادی گروہ کے ہتھے چڑ گیا جو کہ جہادی تربیت دیتے تھے جس کے نتیجے میں وہ والدین کے سامنے عضیلی تقریر کرتا تھا اور برملا اظہار کرتا کہ گاؤں کا چودھری امام مسجد اور اس کے خاندان کو کمین سمجھتے ہیں اور مسجد کے لیے روٹیاں مانگنے پر کتا کہہ کر پکارتے ہیں جس کا میں ان سے بدلہ لوں گا۔

مختصر یہ کہ اکیسویں میں شایع ہونے والے ناولوں میں اطہر بیگ کے ناول جہاں موضوع اور اسلوب کے حوالے سے منفرد حیثیت رکھتے ہیں وہیں ان میں کہیں کہیں سماجی اور تاریخی مزاحمتی بیانیہ بھی پایا جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اقبال خورشید، غلام باغ کے خالق، منفرد تخلیق کار، مرزا اطہر بیگ سے اقبال خورشید کا مکالمہ، مشمولہ، سہ ماہی، اجرا، (مدیر: احسن سلیم) کراچی: شمارہ نمبر ۱۴، ص:۵۸

۲۔ ایضاً، ص:۵۸

۳۔ اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، لاہور، سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص:۲۸

۴۔ ایضاً، ص:۶۷

۵۔ ایضاً، ص:۸۴

۶۔ ایضاً، ص:۱۷۱

۷۔ ایضاً، ص:۲۹۱

۸۔ ایضاً، ص:۲۹۳

۹۔ ایضاً، ص:۳۲۵

۱۰۔ ایضاً، ص:۸۷۱

۱۱۔ اطہر بیگ، مرزا، صفر سے ایک تک، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص:۴۲

۱۲۔ ایضاً، ص:۱۷۱

۱۳۔ اقبال خورشید، مرزا اطہر بیگ کی صورت حال، لاہور، روزنامہ ایکسپریس، ۲۔ نومبر ۲۰۱۴ء، ادبی صفحہ

۱۴ مرزا اطہر بیگ، حسن کی صورتِ حال۔ خالی۔۔۔ جگہیں۔۔۔ پُر۔۔۔ کرو" لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، 2014ء ص:۶۶۔۶۷

۱۵۔ ایضاً، ص:۶۷